تعلیم اور سماجی نظام

برٹرینڈ رسل

مترجم۔ قاضی جاوید

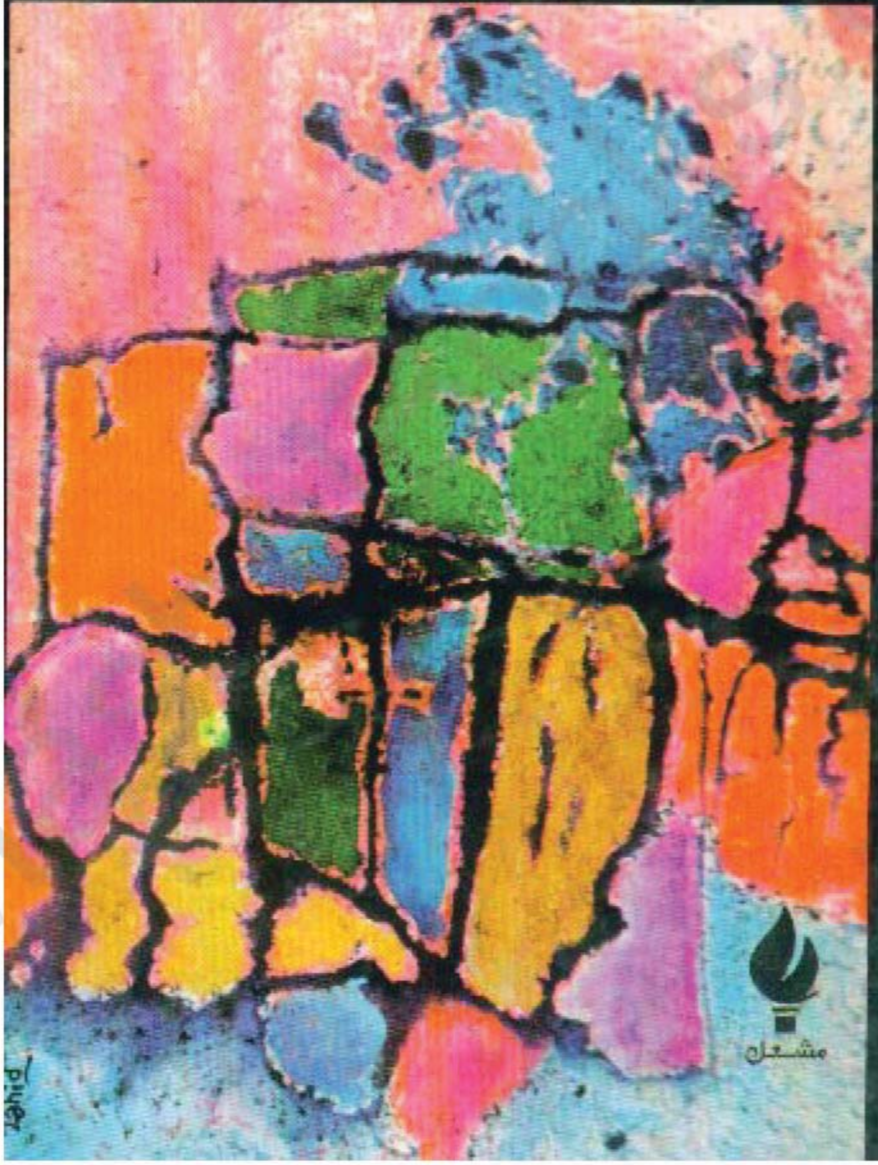

مشعل

تعلیم اور سماجی نظام

MashalBooks.org

تعلیم اور سماجی نظام

برٹرینڈ رسل

مترجم: قاضی جاوید

مشعل

آر۔بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600 ' پاکستان

MashalBooks.org

تعلیم اور سماجی نظام

مصنف: برٹرینڈ رسل

اردو ترجمہ: قاضی جاوید

کاپی رائٹ (c) انگریزی انون اینڈ ہائی مین
کاپی رائٹ (c) اردو ــ 1992 مشعل

پہلی اشاعت 1992

دوسری اشاعت 1996

تیسری اشاعت 2010

ناشر: مشعل

آر بی 5 ، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور-54600، پاکستان

فون و فیکس 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

ترتیب

پہلا باب	فرد اور شہری کا موازنہ	۵
دوسرا باب	تعلیم کا منفی نظریہ	۱۹
تیسرا باب	تعلیم اور وراثت	۳۰
چوتھا باب	جذبہ اور نظم وضبط	۳۷
پانچواں باب	گھر بمقابلہ سکول	۴۴
چھٹا باب	امرا، جمہوریت پسند اور افسر شاہی	۵۲
ساتواں باب	تعلیم اور انبوہ	۶۲
آٹھواں باب	تعلیم اور مذہب	۷۲
نواں باب	تعلیم اور جنس	۸۴
دسواں باب	تعلیم میں حب الوطنی	۹۵
گیارہواں باب	تعلیم میں مقابلے کا تصور	۱۰۶
بارہواں باب	تعلیم اور معاشیات	۱۲۰
تیرھواں باب	تعلیم میں پروپیگنڈا	۱۳۲
چودھواں باب	انفرادیت اور شہریت میں ہم آہنگی	۱۴۶

MashalBooks.org

پہلا باب

فرد اور شہری کا موازنہ

جدید زمانے کی تمام مہذب ریاستیں تعلیم کو پسندیدہ خیال کرتی ہیں۔ ان کے باوجود بعض ایسے لوگ ہر عہد میں اس رائے سے اختلاف کرتے رہے ہیں، اور ان کی رائے احترام کی حامل رہی ہے۔ تعلیم کی مخالفت کرنے والوں کا نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ تعلیم اپنے مقرر کردہ مقاصد حاصل نہیں کرسکتی۔ لہٰذا ان صاحبان کی رائے کا مناسب تجزیہ کرنے سے پہلے ہمیں لازماً یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کون سے مقاصد ہیں جن کو ممکنہ طور پر حاصل کرنا تعلیم کا کام ہے۔ اس موضوع پر ویسے ہی مختلف نقطۂ ہائے نظر ہیں جیسے کہ انسانی فلاح سے متعلق بہت سے تصورات ہیں۔ البتہ ایک ایسی مزاجی خلیج بھی ہے جو دوسرے تمام اختلافات سے زیادہ گہری ہے۔ یہ خلیج تعلیم کو بنیادی طور پر انفرادی نفسیات کے حوالے سے دیکھنے والوں اور اس پر جماعت کے حوالے سے غور کرنے والوں کے مابین حائل ہے۔

یہ فرض کرتے ہوئے (جیسا کہ ہم آئندہ باب میں دلائل پیش کریں گے) کہ تعلیم کو محض نشو ونما کی راہ میں حائل رکاوٹیں ہی دور نہیں کرنی چاہیں بلکہ تربیت کا سامان بھی بہم پہنچانا چاہیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا تعلیم کا مقصد اچھے افراد پیدا کرنا ہے یا اچھے شہریوں کی تربیت کرنا ہے۔ وہ صاحبان جو ہیگل کے خیالات کے حامی ہیں وہ تو ضرور ہی کہیں گے کہ ایک اچھے شہری اور اچھے فرد میں کوئی تضاد نہیں ہوسکتا۔ اچھا فرد وہ ہے جو اجتماعی بھلائی کو پیش نظر رکھتا ہے اور جہاں تک اجتماعی بھلائی کا تعلق ہے وہ افراد کی بھلائی پر ہی مشتمل ہوا کرتی ہے۔ خیر، ایک مطلق مابعد الطبعیاتی صداقت کے طور پر میں اس نظریئے کی تائید کرنے یا اس سے اختلاف کرنے پر آمادہ نہیں۔ تاہم روزمرہ کی عملی زندگی میں ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ بچے کو مستقبل کا ایک شہری خیال کرتی ہے۔ بظاہر دکھائی یہ دیتا ہے کہ انفرادی ذہن کی تربیت مفید شہری کی تیاری سے مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جمیز

MashalBooks.org

واٹ کے مقابلے میں گوئٹے کم مفید شہری تھا، لیکن فرد کی کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اسے لازماً جمیز واٹ سے بہتر خیال کرنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ انفرادی بھلائی اجتماعی اچھائی کا محض ایک جزو نہیں، بلکہ اس کے علاوہ بھی کوئی شے ہے۔ انفرادی بھلائی کے بارے میں مختلف لوگوں کی رائے سے مختلف ہوا کرتی ہے اور میں ان لوگوں کے ساتھ بحث کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا جو میری رائے سے مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ نظریہ چاہے جو بھی ہو، اس حقیقت کو جھٹلانا دشوار ہے کہ فرد کی نشو و نما اور شہری کی تربیت میں فرق ہے۔

فرد کی بھلائی کون سے عناصر پر مشتمل ہے؟ یہاں میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ ضروری نہیں کہ دوسرے لوگ بھی میرے ساتھ متفق ہوں۔

پہلی اور اہم بات تو یہ ہے کہ جرمن فلسفی لائبنٹز کے واحدوں کی طرح فرد کو بھی دنیا کی عکاسی کرنی چاہیے۔ کیوں؟ میرے پاس اس سوال کا جواب محض یہ ہے کہ علم اور ہمہ گیریت مجھے ایسی دو شاندار خوبیاں معلوم ہوتی ہیں جن کے حوالے سے میں نیوٹن کو کستورا مچھلی پر ترجیح دے سکتا ہوں۔ اپنے ذہن میں مکان کی وسعتوں، سورج اور چاند ستاروں کے ارتقاء زمین کے ارضیاتی ادوار اور نسل اندانی مختلف تاریخ کو واضح اور مرکز و انداز میں سمیٹ لینے والا شخص میرے نزدیک کسی شے کے بغیر امتیازی انسانی عمل میں شریک دکھائی دیتا ہے وہ فطرت کے متنوع مناظر میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

انسان کی فضلیت کی بنیاد اگرچہ اس کے شعور پر ہے لیکن یہی سب کچھ نہیں۔ محض کائنات کی آئینہ داری کافی نہیں۔ یہ آئینہ داری جذبے کے ساتھ ہونی چاہیے۔ جذبہ مقصد کے حسب حال ہونا چاہیے اور محض علم حاصل کرنے کے عمل میں ایک عمومی مسرت کو شامل حال ہونا چاہیے۔ پھر بھی ایک مکمل اور بھرپور انسان کے لیے جاننا اور محسوس کرنا ہی کافی نہیں۔ اس تغیر پذیر دنیا میں انسان خود بھی تبدیلی کا باعث ہے۔ اپنی اس حیثیت کے شعور میں انسان اپنے ارادے کو بروئے کار لاتے ہیں اور قوت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ انسانی ذات کی تکمیل کی جستجو میں علم، ارادہ اور قوت کو ممکنہ حد تک وسعت دینی چاہیے۔ روایتی مذہبی فکر کے مطابق قوت، دانش اور محبت تثلیث کے تین اوصاف ہیں۔ کم از کم اس حوالے سے انسان نے اپنے ہی روپ میں خدا کو تخلیق کیا ہے۔

اس ساری بحث میں ہم انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھ رہے ہیں۔ نقطۂ نظر کا یہ وہی انداز ہے جو بدھ مت، رواقی فلسفیوں، مسیحی درویشوں اور تمام صوفیوں کا رہا ہے۔

MashalBooks.org

ایک مکمل فرد میں علم جذبہ کے جن عناصر کی ہم نے تصویر کشی کی ہے، وہ بنیادی طور پر سماجی نہیں ہیں۔ ارادے اور قوت کو بروئے کار لانے کے بعد ہی وہ فرد، جس کا ہم تصور کر رہے ہیں، کسی معاشرے کا موثر رکن بن سکتا ہے۔ اس صورت میں بھی ارادہ کسی انسان کو جو مقام مہیا کر سکتا ہے، وہ ایک آمر کا ہے۔ فرد کے ارادے کو اگر الگ تھلگ کر کے دیکھا جائے تو وہ خدائی ارادے جیسا دکھائی دیتا ہے جو ''کن'' کہنے کا عادی ہے۔ شہری کا رویہ اس سے بہت مختلف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ دنیا میں محض اس کا ارادہ ہی موجود نہیں ہے۔ وہ کسی نہ کسی انداز سے معاشرے میں موجودہ متصادم ارادوں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرد کی حیثیت سے ہر فرد اپنے تئیں قائم بالذات ہے جبکہ شہری لازمی طور پر اپنے آپ کو ہمسایوں میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ بلاشبہ روبنسن کروسو کے سوا ہم سب شہری ہیں اور یہ امر لازمی طور پر تعلیم کے پیش نظر رہنا چاہیے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی زندگی کی مصلحت کوشیوں اور عملی سمجھوتوں پر آمادہ ہونے سے پہلے اگر ہم فرد کے طور پر اپنے امکانات سے آگاہ ہوں تو بالآخر ہم بہتر شہری بن سکیں گے۔ ایک شہری کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ عملی طور پر نہ سہی، کم از کم ارادے کے اعتبار سے دوسرے لوگوں کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوتا ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ جو شخص تعاون کرنے کا خواہش مند ہوا اسے، بشرطیکہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل نہ ہو، کسی ایسے بنے بنائے مقصد کی تلاش ہوتی ہے، جس کو وہ اپنا رہنما بنا سکے۔ کوئی بہت زیادہ غیر معمولی عظمت کا حامل شخص ہی الگ تھلگ رہ کر ایسا کوئی منصوبہ بنا سکتا ہے جو دوسروں کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بن سکے۔ نیز صرف ایسا شخص ہی مقصد کا تعین کرنے کے بعد دوسروں کو اس میں تعاون کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ تاریخ میں ایسے لوگ ہوئے ہیں۔ بہرحال یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ شہریت کی ایسی خلوت گزیں اور تخلیقی صورتیں شاذ و نادر ہی ہوا کرتی ہیں اور وہ اس قسم کی تعلیم سے شاید ہی پیدا ہوتی ہیں جس کا مقصد شہریوں کی تربیت ہو۔ حکومتوں کے نزدیک شہریوں کا تصور یہ ہے کہ وہ حالت کو جوں کا توں رکھنے کے خواہش مند لوگ ہوتے ہیں اور کسی تبدیلی کو روکنے کے لیے تگ و دو بھی کرتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اگرچہ تمام حکومتیں صرف اور صرف اسی قسم کے جمود پسند عوام تیار کرنا چاہتی ہیں، لیکن تاریخ میں ان کے ہیرو ہو بہو اسی قسم کے افراد ہیں جو قطعی طور پر ''جمہوریت پسند'' نہیں۔ مثال کے طور پر امریکی جارج واشنگٹن اور جیفرسن کے گن گاتے ہیں، لیکن ان جیسے سیاسی خیالات رکھنے

MashalBooks.org

والوں کو قید خانے میں بند کر دیتے ہیں۔ تمام مغربی قومیں حضرت عیسیٰؑ کی مداح ہیں لیکن وہ آج کے زمانے میں زندہ ہوتے تو پولیس کے جاسوس ان کا پیچھا کر رہے ہوتے۔ اسی طرح امریکی انہیں حق شہریت دینے سے انکار کر دیتے کیونکہ حضرت عیسیٰؑ ہتھیار باندھنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایک نصب العین کی حیثیت سے شہریت ناکافی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہریت تخلیقی پن سے عاری ہے۔ شہری، حکومتوں سے، چاہے وہ شخصی ہوں یا جمہوری، مصالحت پر آمادہ رہتے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جو عظیم ترین افراد کے امتیازی اوصاف کی ضد ہے اگر اس امر پر زیادہ زور دیا جائے تو وہ عام لوگوں کو اس عظمت کے حصول سے روکتی ہے جس کے وہ اہل ہوتے ہیں۔

میں ہرگز نہیں چاہتا کہ مجھے بغاوت کے حامی کے طور پر سمجھا جائے۔ بذات خود بغاوت مصالحت پسندی سے کسی طور بہتر نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا تعین بھی قدر کے معاملے میں خالص نجی فیصلے کے بجائے خارجی عوامل ہی سے ہوتا ہے۔ بغاوت کی تعریف یا ملامت کا دارومدار اس شے پر ہوتا ہے جس کے خلاف کوئی شخص بغاوت کا پرچم بلند کرتا ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھار بغاوت کا امکان موجود رہنا چاہیے اور صرف اندھا دھند مصلحت کوشی ہی قائم نہ رہنی چاہیے جسے سمجھوتہ پسندی کی بے لچک تعلیم نے پیدا کیا ہو۔ بغاوت اور مصلحت کوشی سے بھی زیادہ اہم بات غالباً یہ ہے کہ انسان کے لیے ایک بالکل نیا طرزِ عمل اختیار کرنے کا امکان موجود رہنا چاہیے۔

تعلیم، سیاست، اخلاقیات اور مابعد الطبیعات میں شہریت اور فردیت کا فرق اہم ہے۔ تعلیم کے شعبے میں وہ نسبتاً ایک سادہ عملی پہلو کا حامل ہے جس پر کسی حد تک نظری مسئلے سے ہٹ کر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ کسی پورے معاشرے کے نوجوانوں کی تعلیم ایک مہنگا کام ہے اور یہ کام زیادہ تر ریاست ہی کے ذمے ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ چرچ یا مذہب ہی ایک ایسی تنظیم ہے جو نوجوانوں کے ذہنوں کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرنے کی خواہش مند ہو سکتی ہے۔ ریاست کا مقصد بلاشبہ یہ ہے کہ شہریوں کی تربیت کی جائے۔ قرونِ وسطیٰ میں معاملہ یہ تھا کہ تعلیم کا مطلب محض پادریوں کی تعلیم لیا جاتا تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے دور سے حالیہ زمانوں تک اس سے مراد شرفا کی تعلیم تھی۔ امارات پرست جمہوریت کے زیر اثر اب اس کا مطلب ایسی تعلیم ہو گیا ہے جو انسانوں کو اشرافیہ کا ظاہری رنگ و روپ عطا کر دے۔ مدرسوں میں ایسی بہت سی باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے جن کا اچھا شہری

بنانے سے تعلق کم ہی ہوتا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ شائستہ اور مہذب بن جائیں۔ تعلیم کے دوسرے عناصر قرون وسطیٰ کی مذہبی روایت کی یادگار ہیں جس کا مقصد انسان کو خدا کے طور طریقوں کو سمجھنے کے قابل بنانا تھا۔ شرافت اور خدا پرستی شہری کے بجائے فرد کے اوصاف ہیں۔ عیسائیت بہ حیثیت مجموعی فرد کا مذہب ہے اور وجہ یہ ہے کہ اس کا ظہور ایسے لوگوں کے درمیان ہوا جو سیاسی قوت سے محروم تھے۔ بنیادی طور پر عیسائیت کا واسطہ روح اور خدا کے مابین تعلق سے ہے، اگرچہ اس نے فرد اور اس کے ہمسائیوں سے تعلق پر بھی نگاہ ڈالی ہے، لیکن وہ اس تعلق کو قوانین اور سماجی اداروں کے بجائے انسان کے اپنے جذبوں کا نتیجہ خیال کرتی ہے۔

آج کے دور کی عیسائیت میں جو سیاسی عنصر دکھائی دیتا ہے وہ شہنشاہ کانٹسٹائن کی عطا ہے۔ اس کے زمانے سے پہلے حکومت کا حکم نہ ماننا ہر عیسائی کا فرض سمجھا جاتا تھا۔ لیکن کانٹسٹائن کے زمانے سے زیادہ تر رواج یہ چلا آ رہا ہے کہ حکومت کی فرمان برداری عیسائیوں کا فرض ہے۔ اس کے باوجود عیسائیت میں انارکیت کا جو عنصر تھا، اس نے ایسا خمیر چھوڑا ہے جس کی وجہ سے عیسائیت کی پوری تاریخ میں نافرمانی کے ابتدائی رویئے کا بار ہا احیا ہوتا رہا ہے۔ بہت سے ایسے مسیحی گروہ اور جماعتیں پیدا ہوتی رہی ہیں جنہوں نے باطنی روشنی کو ترجیح دیتے ہوئے مختلف طریقوں سے بیرونی اقتدار کو رد کیا ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقے کا آغاز بھی اقتدار کے خلاف بغاوت سے ہوا لیکن حکومت پر اختیار حاصل ہونے کے بعد سے اسے مذہبی اختیارات کے استعمال کا کوئی منطقی جواز نہیں مل سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باطنی منطق کے زیر اثر پروٹسٹنٹ فرقے کو مذہبی رواداری قبول کرنا پڑی۔ یہ وہ اصول ہے جسے کیتھولک فرقے نے کبھی نظری طور پر قبول نہیں کیا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ عارضی مصلحتوں کے باعث کیتھولک فرقے نے بھی مذہبی رواداری کے اصول کو عملی طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس حوالے سے کیتھولک رویہ رومی شہنشاہ کی روایت کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ پروٹسٹنٹ ازم نے حضرت عیسیٰ کے حواریوں اور عیسائیت کے ابتدائی داعیوں کی فرد پرستی سے رجوع کیا ہے۔

مذاہب کو یوں بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو ایسے مذاہب ہیں جو سیاسی ہیں اور دوسری طرف ایسے مذاہب ہیں جو انفرادی روح سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثال کے طور کنفیوشس کا مذہب سیاسی تھا۔ بہت سے شاہی درباروں میں گھومنے پھرنے کے باعث

بنیادی طور پر کنفیوشس کو حکومت کے مسئلے میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ ایسی خوبیوں کی تعلیم دینا چاہتا تھا جو اچھی حکمرانی کو سہل بنا دیں۔ بدھ مت لازمی طور پر ایک غیر سیاسی مذہب ہے حالانکہ شروع شروع میں وہ بادشاہوں کا مذہب رہ چکا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ غیر سیاسی رہا ہے۔ چنانچہ تبت میں وہ پاپائیت کی طرح سیاسی ہے۔ جاپان میں مجھے ایسے بدھ زعما سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو برطانوی کلیسا کے اعلیٰ عہدے داروں کی یاد دلاتے تھے۔ اس کے باوجود بدھ مت کا کوئی پیروکار اپنے زیادہ مذہبی لمحات میں خود کو بالکل تنہا خیال کرتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام اپنے آغاز ہی سے سیاسی مذہب رہا ہے۔ بانئ اسلام نے اپنے آپ کو انسان کا حکمران بنایا اور پہلی جنگ عظیم تک ان کے جانشین خلاف کی بھی یہی کیفیت رہی۔ اسلام اور عیسائیت میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ خلیفہ کی ذات میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کا اقتدار شامل ہوتا تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک ان دونوں قسم کے اقتدار میں فرق بھی نہیں ہے جبکہ اپنی غیر سیاسی حیثیت کی بنا پر عیسائیت نے پوپ اور شہنشاہ کی صورت میں دو قسم کے رقیب سیاست دانوں کو جنم دیا۔ ان میں سے پوپ نے لادینی حکمرانی کو غیر اہم ٹھہراتے ہوئے دنیاوی اقتدار پر بھی دعویٰ جتایا۔ روس میں جس طرح کے کمیونزم کو فروغ حاصل ہوا، اس نے اسلام جیسے سیاسی مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ تاہم وہ ناگزیر طور پر بازنطینی روایت سے متاثر ہوا ہے اور اس امر کا امکان موجود ہے کہ کمیونسٹ پارٹی چرچ کی جگہ لے لے اور دنیاوی حکومت کو مذہبی اقتدار سے اس قدر آزادی عطا کر دے جس قدر اشتراکی انقلاب سے پہلے اسے حاصل تھی۔ دوسرے امور کی طرح اس معاملے میں بھی روس مشرقی اور مغربی دو طرح کی ذہنیتوں میں منقسم ہے۔ جس حد تک روس ایشیائی ہے، اس حد تک کمیونسٹ پارٹی کی حیثیت خلافت جیسی ہے۔ دوسری طرف جس حد تک روس یورپی ہے، اس حد تک کمیونسٹ پارٹی کو چرچ کی حیثیت حاصل ہے۔

تاریخ مذاہب کے اس طائرانہ جائزے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ موجودہ تعلیم کے جو عناصر انفرادی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں، وہ زیادہ تر روایت کی پیداوار ہیں اور امکان یہ ہے کہ شہریت کی تعلیم ان کی زیادہ سے زیادہ جگہ لے لے گی۔ شہریت کی تعلیم اگر دانش مندانہ ہو تو وہ انفرادی تہذیب کے بہترین عناصر کو برقرار رکھ سکتی ہے لیکن اگر وہ

کوتاہ نظر ہوئی تو وہ فرد محض اس لیے برباد کردے گی کہ اسے حکومت کا آسان آلہ کار بنایا جا سکے۔ لہٰذا یہ بات ضروری ہے کہ جب شہریت کے مقاصد کا تعین کوتاہ نظری سے کیا جائے تو پھر اس میں مضمر خطرات کا احساس بھی کرلیا جائے۔ تعلیم کے سرکاری نظاموں کے پالیسی سازوں کی پستی کا سبب بنیں گے۔ صرف وسیع تر انفرادی تہذیب وشائستگی کے حامل صاحبان ہی یہ سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں کہ انفرادی تہذیب شہریت کو کیا کچھ عطا کرسکتی ہے۔ یہ بدقسمتی ہے کہ آج کے زمانے میں انتظامی اہلیت کے حامل افراد یا محض سیاستدان، جن کو خدمات کا صلہ دینا مقصود ہو، اس قسم کے صاحبان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔

اچھے شہری پیدا کرنے کا مقصد رکھنے والی تعلیم کی دو بہت مختلف صورتیں ممکن ہیں۔ ایک وہ جس کا مقصد موجودہ نظام کی تائید کرنا اور دوسری وہ جس کا مقصد اس کا تختہ الٹنا ہے۔ تعلیم میں ریاست کی اہمت کے پیش نظر یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ تعلیم کا کم وبیش ہمیشہ ہی یہ مقصد ہوگا کہ موجودہ نظام کی تائید وحمایت کی جائے۔ تاہم معاملہ یہ نہیں ہے۔ روس کے سوا اشترا کیوں کو جہاں بھی اقتدار حاصل ہوا ہے، وہاں مذہب اور درمیانے طبقے کا اثر ورسوخ اس قدر ضرور ہے کہ وہ تعلیم کے بیشتر حصے کو رجعت پسندانہ رکھ سکے۔ دوسری طرف انقلاب فرانس اور اسی طرح انقلاب روس سے پہلے تعلیم اگرچہ عام نہ تھی، لیکن اپنی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ تر حکومت کے خلاف تھی۔ امریکہ کے زیادہ پسماندہ علاقوں میں آج بھی یہی رجحان دکھائی دیتا ہے۔ کم وبیش غیر ارادی طور پر امریکہ کی ریاستی یونیورسٹیاں ایسے نظریات کی تعلیم دینے کا رجحان رکھتی ہیں جو ان بے خبر کسانوں کے حسب حال نہیں ہیں جن کے ادا کردہ ٹیکسوں کے سہارے یہ یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ قدرتی طور پر کسان سوچتے ہیں کہ جو کوئی نے نواز کو بلاتا ہے، نے کا تعین بھی وہی کرتا ہے۔ یونیورسٹیوں کے معاملے میں صورت حاصل کو مختلف پا کر انہیں کوفت ہوتی ہے۔

خیر، ان مستثنیات کے باوجود دنیائے جدید میں تعلیم ایک رجعت پسند قوت ہے۔ حکومت قدامت پسند ہو تو وہ اس کی حمات کرتی ہے اور اگر حکومت ترقی پسند ہو تو وہ اس کی مخالفت کرتی ہے۔ یہ بھی بدقسمتی کی بات ہے کہ سکولوں اور یونیورسٹیوں میں اچھے شہری کے جن عناصر پر زور دیا جاتا ہے، وہ بہترین ہونے کے بجائے بدترین ہیں۔ سب سے زیادہ زور ایک جارحانہ قسم کی وطن پرستی پر دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی تمام علاقوں کے لوگوں کے مقابلے میں ایک مخصوص علاقے کے لوگوں سے تنگ نظر وابستگی

رکھی جائے اور منتخب علاقے کے لوگوں کے مفادات کو فروغ دینے کے لیے فوجی قوت کے استعمال سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ جہاں تک داخلی امور کا تعلق ہے شہریت، جیسا کہ عموماً اس کی تعلیم دی جاتی ہے، روایتی اکثریت نے سرمایہ داروں کی حمایت کرنے کو حب الوطنی کا تقاضا سمجھا تھا۔ ان میں سے شاید ہی کسی کی تعلیم اس طرح ہوئی تھی کہ وہ ہڑتالی محنت کشوں کے نقطۂ نظر سے اس معاملے کو دیکھنے کے قابل ہو سکے۔

جہاں کہیں ناانصافی موجود ہے، اس کی تائید میں ضابطہ وآئین پرستی کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ روس کے سوا باقی تمام ملکوں میں معلمین یا تو جسمانی ساخت کے اعتبار ہی سے بزدل ہوتے ہیں یا پھر اپنی آمدنی یا امارت پرستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر امرا کے حمایتی ہوا کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان کی تعلیم قانون وآئین کی اہمیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کا رجحان رکھتی ہے، حالانکہ قانون وآئین دونوں ماضی کو حال پر مفلوج کر دینے والی گرفت عطا کرتے ہیں۔ اس زائد از ضرورت اصرار کے خلاف ردعمل کے طور پر دنیا میں بنیادی تبدیلی لانے کے خواہش مند مجبوراً انقلابی بن جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کسی انقلابی کے ذہن میں بھی فرض کا وہی تصور ہو جو قانون اور نظم و ضبط کی وکالت کرنے والے کے تصور کی طرح محدود ہو اور جو بالآخر ویسا ہی خطرناک بھی ہو۔

خیر، بعض امور ایسے بھی ہیں جن میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ تبدیلی کے حامی جمود پرستوں کے مقابلے میں بہتر تعلیم مہیا کریں گے۔ پرانے اور بوسیدہ طور طریقوں کو پسند کرنے کے لیے محض حیوانی عادت ہی کافی ہے، ویسے ہی جیسے سڑک پر روزمرہ کے موڑ پر پہنچ کر گھوڑا خود بخود ہی مڑ جایا کرتا ہے۔ قدامت پرستی کے لیے کوئی اعلیٰ تر ذہنی عمل درکار نہیں ہوتا۔ تبدیلی کے حامی کا معاملہ البتہ اور ہے۔ اسے خاص حد تک قوت تخیل کا حامل ہونا ضروری ہے تا کہ وہ بنی بنائی راہ سے ہٹ کر کچھ سوچ سکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اقدار کے نقطۂ نظر سے حال کو جانچنے کی کسی قدر صلاحیت رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں چونکہ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حامی بھی موجود ہیں، لہٰذا اسے یہ احساس بھی ہونا چاہیے کہ کم از کم دو ایسے نقطۂ ہائے نگاہ موجود ہیں جن کو کوئی معقول شخص اختیار کر سکتا ہے۔ مزید براں وہ اپنے آپ کو موجودہ ظلم و زیادتیوں کا شکار

MashalBooks.org

ہونے والوں کے لیے اپنی ہمدردی کے دروازے بند کرنے پر مجبور نہیں پاتا۔ اسے یہ ضرورت بھی نہیں ہوتی کہ وہ ایسے مصائب کو ختم نہ کرنے کے حق میں دلائل گھڑتا رہے جن کو آسانی سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا جو تعلیم جمود پرستی کے خلاف ہو، وہ جمود پرستی کی تائید کرنے والی تعلیم کے مقابلے میں ذہانت اور ہمدردی کو کم نقصان پہنچاتی ہے۔

بہرحال اس معاملے کی بھی چند حدود ہیں۔ موجودہ نظام کی مخالفت دو میں سے کسی ایک ذریعہ سے پیدا ہوسکتی ہے۔ اول یہ کہ وہ بدنصیبوں کے ساتھ ہمدردی سے پیدا ہو سکتی ہے اور دوئم یہ کہ وہ خوش نصیبوں سے نفرت سے جنم لے سکتی ہے اگر مخالفت دوسرے ذریعے سے پیدا ہو تو اس میں ہمدردی اتنی ہی محدود ہوتی ہے جتنی کہ قدامت پسندی میں مضمر ہوتی ہے۔ اپنے خیالات کی دنیا میں بہت سے انقلابیوں کو عوام کو ملنے والی خوشیوں سے اتنا سروکار نہیں ہوتا جتنا ان کو اس بات کا خیال ہوتا ہے کہ انقلاب برپا ہونے کے بعد وہ ان صاحبان اقتدار سے انتقام لے سکیں گے جو ان کے موجودہ مصائب کے ذمہ دار ہیں۔ یہ بھی ہے کہ عقلی اعتبار سے تبدیلی کے حامیوں میں گروہ بندی کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ گروہ بندی تنگ نظری اور نفرت کی اساس پر معرض وجود میں آتی ہے، عقیدہ پرستی جیسی بھی ہو وہ ذہانت کی موت ہے۔ اس معاملے میں انقلابیوں کی عقیدہ پرستی کسی طور پر بھی رجعت پسندوں ک عقیدہ پرستی سے بہتر نہیں۔

انفرادی تہذیب اور شہریت کی تنگ نظر، تعلیم میں پائے جانے والے اہم ترین اختلافات میں سے ایک کا تعلق مشکوک سوالات سے متعلق سائنسی رویئے سے ہے۔ سائنس نے ایک خاص طریقہ کار کو فروغ دیا ہے جو بنیادی طور پر دریافت، یعنی تبدیلی کا طریقہ کار ہے۔ عمومی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائنسی رویہ وہ ہے جو دریافت کے لیے راہ ہموار کرتا ہے نہ کہ وہ جو انسان کو سائنس کے موجودہ نظریات پر غیر متزلزل ایمان رکھنے پر آمادہ کرتا ہے۔ تعلیم یافتہ شہری عموماً دریافت کاری کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ بزرگوں اور بہتر لوگوں کا عقیدت مند ہوتا ہے اور موجودہ نظام کو درہم برہم کرنے والے تمام نظریوں سے خوف زدہ ہوتا ہے۔ جدید ریاست، جس کی اساس سائنس پر رکھی گئی ہے، اپنے آپ کو مشکل میں پاتی ہے۔ بعض ریاستیں ایسی ہیں جو ایسے غیر مقلد لوگوں کو پسند کرتی ہیں جو تباہ کاری کا نیا ساز و سامان تیار کرسکیں جبکہ دوسری ریاستوں کی

MashalBooks.org

ترجیح یہ ہوتی ہے کہ ان کے نوجوان عقیدہ پرست رہیں اور ماضی کی عظیم روایات کا بوجھ اٹھائے رکھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب بازنطینی لوگ مغربی دنیا کو چند مذہبی رعایتیں دے کر اس کی امداد حاصل کر سکتے تھے لیکن اس کے برخلاف انہوں نے اپنے عقیدوں کی حفاظت کو ترجیح دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ترکوں کے ہاتھوں شکست اٹھانا پڑی۔

ہمارے عہد کے تضادات میں سے ایک یہ ہے کہ سائنس جو قوت اور خاص طور پر سرکاری قوت کا وسیلہ ہے، اس کی پیش رفت کا انحصار تحقیق کار کے ذہن کی نزاجی کیفیت پر ہے۔ سائنسی ذہن کا معاملہ یہ ہے کہ وہ شک پرست ہوتا ہے اور عقیدہ پرستی پر مائل نہیں ہوتا۔ شک پرست کے نزدیک سچائی کو دریافت نہیں کیا جا سکتا، جبکہ عقیدہ پرست سمجھتا ہے کہ سچائی کو پہلے ہی دریافت کیا جا چکا ہے۔ ان دونوں کے برخلاف سائنس دان کا نقطۂ نظر یہ ہوتا ہے کہ کم از کم ان امور میں جن میں وہ تحقیق کر رہا ہے، اگر حقیقت پہلے سے معلوم نہیں ہو چکی تو وہ قابل علم ضرور ہے۔ خیر یہ کہنا بھی کہ سچائی قابل علم ہے، سائنس دان کے رویہ سے انصاف کرنا نہیں ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ اپنی دریافتوں کو حتمی اور مطلق نہیں سمجھتا، بلکہ انہیں ایسے اندازے خیال کرتا ہے جن کی درستگی مستقبل میں ہو سکتی ہے۔ سائنس میں قطعیت جیسی کوئی شے نہیں۔ درحقیقت قطعیت کا فقدان سائنسی رویئے کی روح ہے۔ لہٰذا سائنس دان کے اعتقادات عارضی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں جہاں تک یہ اعتقادات سائنس دان کی اپنی تحقیقات کا ثمر ہوتے ہیں، اس حد تک ان کی حیثیت اجتماعی کے بجائے شخصی ہوتی ہے۔ ان کا انحصار سائنس دان کے اپنے مشاہدے اور منطق کے نتائج پر ہوتا ہے نہ کہ اس بات پر کہ معاشرے کے نزدیک کسی اچھے شہری کو کن باتوں میں ایمان رکھنا چاہیے۔ شاید سائنسی رویئے اور حکومت کی طرف سے سائنس کا استحصال کے مابین پایا جانے والا یہ تضاد آخر کار سائنسی ترقی کی راہ ہی مسدود کر دے گا، کیونکہ سائنسی طریقہ کار کو راسخ الاعتقادی اور ایمان کی تلقین و اشاعت کے لیے زیادہ سے زیادہ بروئے کار لایا جانے لگے۔ اس صورت حال سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ جو بچے ایک خاص حد تک سائنس کی طرف میلان ظاہر کریں، انہیں شہریت کی تعلیم سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور انہیں سوچ بچار کی آزادی مہیا کی جائے۔ امتحانات میں ایک خاص حد تک پہنچنے والوں کو اپنے نام کے آگے

MashalBooks.org